R.No. 2186/57
REGD. No. L-922

انجمن ترقی اردو (ہند) کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

فون نمبر ۲۹
سالانہ قیمت ۵ روپے
فی کاپی ۱۵ پیسے

تاریخ اشاعت
۱-۸-۱۵-۲۲

جلد ۲۸، شمارہ ۲۰ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | ۲۲ مئی ۱۹۶۹ء

آل احمد سرور

ذاکر صاحب کی یاد میں

(۳)

ذاکر صاحب ہندوستان کی تقسیم کے خلاف تھے۔ گاندھی جی اور مولانا آزاد بھی اس کے خلاف تھے، مگر تقسیم ہو کر رہی۔ جولائی ۱۹۴۷ء کے شروع میں، کچھ دن کے لئے میں دہلی گیا تھا، قرول باغ میں قیام تھا۔ ایک دن ذاکر صاحب اور شفیق الرحمٰن قدوائی کے ساتھ جامعہ میں گزارا۔ پنجاب سے جو شرنارتھی دہلی آ گئے تھے ان میں اپنا وطن چھوڑنے پر بڑا غم و غصہ تھا۔ دہلی کی فضا میں بڑی بے چینی تھی۔ جامعہ سے ایک بس میں گھنٹہ گھر پہنچا۔ وہاں سے دوسری بس قرول باغ کے لئے لی۔ بس کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ ایک سپاہی بغیر ٹکٹ خریدے اس میں سوار ہو گیا۔ مسافر زیادہ تر پنجابی ہندو تھے۔ اسے گالیاں دے رہے تھے اور لڑنے کو آمادہ تھے۔ میں نے نرمی سے کہا، بھائی جانے دو کیوں جھگڑا کرتے ہو۔ وہ لوگ میرے سر ہو گئے۔ چونکہ میں قمیص پتلون پہنے ہوئے تھا اس لئے شاید مجھے بھی وہ ہندو سمجھے۔ کہنے لگے اسی نرمی نے ہم سے ہمارا وطن چھڑایا۔ ہم تو اس سپاہی کو ماریں گے اور تم بولو گے تو تمہیں بھی۔ میں خاموش ہو گیا۔ اس ایک لمحے میں مجھے احساس ہوا کہ فسادات کا کیسا بھیانک سایہ ہمارے سر پر منڈلا رہا ہے۔ دوسرے دن ہی میں اپنے گھر واپس آ گیا۔

ذاکر صاحب اس زمانے میں بہت پریشان تھے، مگر یہ طے کئے بیٹھے تھے کہ اپنی جگہ سے نہیں ہلیں گے۔ جولائی گزرا۔ اگست آیا۔ پندرہ اگست کو ملک آزاد ہوا۔ جواہر لال نہرو نے اپنی تاریخی تقریر کی۔ آزادی کا نشہ ہم سب پر ابھی آنے نہ پایا تھا کہ فسادات کی شدت اور بربریت نے دہلا دیا۔ نہ معلوم کیسے ذاکر صاحب نے جو بہت تھک گئے تھے کچھ دن کشمیر میں گزارنے کی ٹھانی۔ دہلی سے چلے تو جالندھر کے ایک مسلمان وکیل جو ان کے پرانے جاننے والے تھے ساتھ ہو گئے۔ انھوں نے اصرار کیا کہ جالندھر دو ایک دن ٹھہرتے ہوئے کشمیر جائیے۔ یہ راضی ہو گئے۔ راستے میں کسی دوسرے ڈبے سے ایک ہندو جس نے پہلے کہیں ذاکر صاحب کو دیکھا تھا ان سے ملنے آیا۔ کچھ دیر اس سے باتیں کرتے رہے۔ جالندھر کے اسٹیشن پر اترے تو دیکھا کہ فوج رائفلیں لئے پلیٹ فارم پر موجود ہے۔ قلیوں کا پتہ نہیں اور کچھ والنٹیر جو سیوا سمیتی کے معلوم ہوتے تھے مسافروں کا سامان جلدی جلدی اٹھا کر انھیں ساتھ لیے جا رہے ہیں۔ ذاکر صاحب کا سامان بھی ان لوگوں نے اٹھانا چاہا، مگر ان کے ساتھی وکیل نے انھیں ڈانٹ دیا۔ اس پر فوجیوں نے رائفلیں تان لیں۔ مجبوراً ذاکر صاحب، ان کے وکیل ساتھی ان والنٹیروں کے گھیرے میں روانہ ہوئے۔ راستے میں اسٹیشن ماسٹر کا دفتر پڑا۔ اس کے قریب وہ ہندو نظر آیا جو رات کو ریل میں ذاکر صاحب سے ملا تھا۔ اس نے انھیں بتایا کہ والنٹیروں کے ساتھ جانے میں خطرہ ہے۔ آپ لوگ اسٹیشن ماسٹر کے دفتر میں گھس جائیے۔ یہ لوگ دفتر میں پہنچے تو اسٹیشن ماسٹر نے انھیں چلتا کرنا چاہا کیونکہ باہر سے والنٹیر کڑی نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ اس ہندو نے ان لوگوں سے کہا کہ آپ اسٹیشن ماسٹر کا آفس نہ چھوڑیے گا اور خود بھاگا بھاگا گیا اور فوج کے ایک سکھ افسر کو بلا لیا۔ اسے بتایا کہ ذاکر صاحب گاندھی جی اور جواہر لال نہرو کے دوست ہیں اور انھیں ہر حال میں بچانا ہے۔ اس سکھ افسر نے آ کر ان دونوں کو اپنی حفاظت میں لیا۔ ہجوم کو منتشر کیا اور ذاکر صاحب کو حفاظت کی ایک جگہ پہنچا دیا۔ جب وہاں بھی خطرہ پیدا ہوا تو دوسرے دن مسلح گارد کے ساتھ انھیں دہلی بھیج دیا۔

ذاکر صاحب واپس آئے تھے کہ دہلی میں بڑے پیمانے پر فسادات شروع ہو گئے۔ قرول باغ میں مکتبہ جامعہ کے گودام کو آگ لگا دی گئی۔ جامعہ کی بستی کو ہر طرف سے خطرہ تھا۔ جواہر لال نہرو خود آئے اور جامعہ والوں کی حفاظت کا بندوبست کیا۔ ذاکر صاحب

نے اس زمانے میں ایک سردار کی طرح دن رات حفاظتی تدابیر میں صرف کر دئے، ساتھیوں کی ڈھارس بندھائی۔ آس پاس کے گاؤں والوں سے رابطہ قائم کیا، خورد و نوش کا سامان فراہم کیا اور جب جامعہ کی طرف سے کچھ اطمینان ہوا تو شہر کے ان مسلمانوں کو جو خطرے میں گھرے ہوئے تھے، ہمایوں کے مقبرے کے کیمپ میں پہنچایا اور ان کے کھانے پینے اور حفاظت کا انتظام کیا۔ اس زمانے میں ذاکر صاحب رات گئے تک دلی کی سڑکوں پر ایک جیپ میں اپنی سلامتی سے بے پروا پھرا کرتے تھے۔ جواہر لال نہرو کو معلوم ہوا تو انھوں نے ان کے ساتھ ایک سپاہی کر دیا۔

۱۹۴۸ء میں مولانا آزاد نے یہ محسوس کیا کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی حالت نازک ہے۔ نواب اسماعیل خاں اس وقت وائس چانسلر تھے۔ مگر چونکہ وہ مسلم لیگ کے لیڈروں میں سے تھے اس لئے حکام اور شہر کی اکثریت انھیں شبے کی نظر سے دیکھتی تھی۔ انھوں نے نواب صاحب کو آمادہ کیا کہ وہ استعفےٰ دیدیں اور ذاکر صاحب کا انتخاب کرایا۔ ذاکر صاحب علی گڑھ کو خطرے میں دیکھ کر اس کی خدمت کے لئے تیار ہو گئے۔ ان کی صرف ایک شرط تھی کہ ان کا انتخاب بلا مقابلہ ہو یہ شرط پوری ہوئی اور آخر ۱۹۴۸ء میں ذاکر صاحب علی گڑھ آ گئے۔

ذاکر صاحب تقریباً آٹھ سال علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے۔ انھوں نے جب وائس چانسلری کا عہدہ سنبھالا تو یونیورسٹی کی حالت خاصی نازک تھی۔ بہت سے اساتذہ پاکستان چلے گئے تھے، طلبہ کی تعداد بھی خاصی کم ہو گئی تھی۔ شہر کے ہندو یونیورسٹی سے بدظن تھے۔ علی گڑھ کے اساتذہ اور طلبہ کی اکثریت نے چونکہ پاکستان بنوانے کی تحریک میں بڑی سرگرمی سے حصہ لیا تھا اس لئے ملک میں بھی یونیورسٹی کے خلاف خاصی ناراضگی تھی۔ ذاکر صاحب نے قومی رہنماؤں سے رابطہ قائم کیا۔ راج گوپال آچاریہ اور جواہر لال نہرو کو بلایا۔ شہر کے معقول اور سنجیدہ لوگوں سے ملے۔ اساتذہ کو ڈھارس دی۔ طلبہ سے بات چیت کی۔ قومی زندگی سے ہم آہنگ ہونے اور قومی تصور کو اپنانے پر زور دیا۔ ساتھ ہی یونیورسٹی کی صالح روایات اور اس کے مخصوص رول کی اہمیت پر بھی اصرار کیا۔ اپنی تقریروں اور خطبوں میں بار بار علی گڑھ کو قومیت اور ہندوستانیت کے فرائض یاد دلانے اور ملک و قوم کو علی گڑھ کے رول کو پہچاننے اور اس کی قدر کرنے کی طرف مائل کیا۔ اساتذہ کو علمی کاموں کی طرف راغب کیا۔ طلبہ کو پڑھنے پڑھانے کے علاوہ اپنی زندگی کے دوسرے اہم پہلوؤں، تہذیبی سرگرمیوں اور فنون لطیفہ کے ذوق سے آشنا کیا۔ علی گڑھ کی ویران، گرد آلود، سی شیانی دنیا کو ہرے بھرے میدانوں اور رنگ برنگ کے پھولوں سے بھر دیا۔ باہر سے اچھے اچھے استاد لائے۔ یہاں کے اچھے استادوں کو ترقی دی۔ تصنیف و تالیف سے شغف کی طرف مائل کیا۔ کورٹ میں اس وقت تک صرف مسلمان ہی ممبر ہو سکتے تھے اور وائس چانسلر کا انتخاب بھی کورٹ کرتا تھا۔ ۱۹۵۲ء کے ایکٹ کے بعد سے یونیورسٹی کے کورٹ میں غیر مسلم بھی منتخب ہونے لگے اور وائس چانسلر کا انتخاب اگزکٹو کونسل کرنے لگی۔ اس زمانے میں علی گڑھ کو اس کا کھویا ہوا وقار واپس مل گیا اور علمی دنیا میں اس کا نام بھی آنے لگا۔ جب نیا ایکٹ بنا تو میں لکھنؤ میں تھا۔ میں نے ذاکر صاحب کو خطاب کر کے ایک نظم لکھی تھی۔ اس کے چند شعر یہاں بے موقع نہ ہوں گے۔

اے کہ زخموں سے تری اپنے سیہ خانے میں　　چاند کا نور ستاروں کی چمک باقی ہے
لالہ کاری سے تری باد خزاں کے باوصف　　اپنے ویرانے میں پھولوں کی مہک باقی ہے
یہ تری تلخ نوائی ہے کہ دیوانوں میں　　اپنی منزل پہ پہنچنے کی للک باقی ہے
کون اب تجھ سا ترے پرسوز تخیل کے سوا　　اب بھی ہر ذرے میں شعلوں کی لپک باقی ہے

یہ لہو جس میں تب و تاب نفس سے تیرے　　دیکھ ایوان حکومت میں چراغاں نہ بنے
لوگ ہر شمع کو فانوس پنہا دیتے ہیں　　شعلہ اپنا بھی چراغ تہ داماں نہ بنے
موج پرواز تھی ہر گام پہ طوفان تخلیق　　کسی گلزار کی اک جوئے خراماں نہ بنے

ہند کے جلوہ صد رنگ کا ہے پاس ضرور　　اس میں سوز عرب و حسن عجم یاد رہے
کارواں منزل نو کے لئے ہو گرم سفر　　اپنی تہذیب کا بھی نقش قدم یاد رہے
چمن علم و ادب میں نئی کلیوں کے حضور　　میر و غالب کے شگوفوں کا بھرم یاد رہے

وہ مے خانہ ہر اک رند پہ اب باز رہے
پینے والوں کا مگر پھر بھی اک انداز رہے

ذاکر صاحب نے علی گڑھ میں یہی کیا۔ وہ مے خانہ سب کے لئے کھول دیا۔ مگر پینے والوں کے ایک انداز پر اصرار کیا۔ تنگ نظر یا انتہا پسند حضرات کو ممکن ہے اس میں تضاد نظر آئے یا اسے وہ فریب سمجھیں مگر دراصل ذاکر صاحب کا نقطۂ نظر بالکل صحیح تھا۔ سیکولر ہندوستان میں علی گڑھ کے دروازے سب کے لئے کھلے ہونے ضروری تھے، مگر یہ بھی ضروری تھا کہ علی گڑھ اپنے مخصوص رول کو محفوظ رکھے اور اپنی مذہبی، علمی، تہذیبی و ادبی خصوصیات پر خود بھی فخر کرے اور ملک و قوم کو بھی فخر کرنا سکھائے۔ خراب صحت نے ذاکر صاحب کو ۱۹۵۶ء میں علی گڑھ چھوڑنے پر مجبور کیا، مگر وہ علی گڑھ کو آزاد ہندوستان میں اپنے لئے ایک باعزت جگہ بنانے کا راستہ بتا چکے تھے۔ آزاد ہندوستان نے بھی علی گڑھ کو دل سے قبول کر لیا تھا گویا علی گڑھ میں ان کا کام پورا ہو چکا تھا۔ خدمت کا دور ختم ہو چکا تھا اب حکومت کا دور شروع ہونے والا تھا۔　　(باقی آئندہ)

دلی میں غالب روڈ

نئی دلی، دلی میں شانتی بن کو ایڈورڈ پارک سے ملانے والی سڑک کا نام غالب روڈ رکھا جائے گا۔ یہ تجویز دلی میونسپل کارپوریشن کی اسکیم کا جزو ہے جس کے تحت راجدھانی میں تقریباً ۲۰ سڑکوں اور اسپتالوں اور عمارتوں کے نام تبدیل کئے جائیں گے۔　　(قومی آواز)

ڈاکٹر منظر عباس نقوی

تدریس کے مسائل

(یہ مقالہ انجمن اساتذہ اردو جامعات ہند کی تیسری کانفرنس کے موقع پر پڑھا گیا)

تدریس کے مسائل کو بہ نظر سہولت دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ تدریس زبان سے تعلق رکھنے والے مسائل۔

۲۔ تدریس ادب سے تعلق رکھنے والے مسائل۔

جہاں تک تدریس زبان کا تعلق ہے عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ یہ کام ثانوی تعلیم سے متعلق ہے اور ہمیں یونیورسٹی کی سطح پر صرف تدریس ادب سے سروکار رکھنا چاہئے۔ بلاشبہ اب سے پندرہ بیس سال پیشتر جبکہ اردو زبان کا گھر گھر چرچا تھا اور اس کی تعلیم پہلے درجے سے شروع ہو جاتی تھی یہ توقع کرنا بے جا نہ تھا کہ طالب علم کو دسویں گیارھویں جماعت تک پہنچتے پہنچتے زبان اور اس کے استعمال پر کافی حد تک عبور حاصل ہو جانا چاہئے لیکن ادھر چند سالوں سے ملک کے نظام تعلیم میں جو تبدیلیاں ہوئی ہیں اور اردو کی لسانی حیثیت میں جو تغیر واقع ہوا ہے اس کے باعث صورت حال بالکل مختلف ہو گئی ہے۔ اب ابتدائی جماعتوں میں تو اردو کی تعلیم کا کوئی سوال ہی نہیں ثانوی مدرسوں میں بھی اگر کہیں اردو ایک اختیاری مضمون کی حیثیت سے داخل نصاب ہے بھی تو وہاں اس کو وہ اہمیت نہیں دی جاتی جو دوسری زبانوں کی تعلیم کو دی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب جو طالب علم یونیورسٹی میں داخل ہوتا ہے اس کو زبان پر وہ قدرت نہیں ہوتی جو ادب کے مطالعے کے لئے ناگزیر ہے۔ یونیورسٹی کے اساتذہ میں یہ شکایت عام ہے کہ بی۔ اے ہی نہیں ایم۔ اے کے طلبہ اور طالبات بھی انشا و املا کی ایسی غلطیاں کرتے ہیں جن کی ان سے کوئی توقع نہیں کی جاتی۔ اس صورت حال نے خود تدریس ادب کے کام کو خاصا دشوار بنا دیا ہے۔ بی۔ اے اور ایم۔ اے کے ممتحن کو اس بات کا بخوبی اندازہ ہوگا کہ اردو ادب کا مطالعہ کرنے والوں میں ایسے طلبہ کی کمی نہیں جو اگرچہ نفس موضوعات سے واقفیت رکھتے ہیں لیکن ان میں یہ صلاحیت نہیں ہوتی کہ اپنے خیالات کو صحت ترتیب اور سلیقے کے ساتھ ادا کر سکیں۔ کیا ان حالات میں تدریس زبان کے مسائل سے آنکھیں بند کئے رہنا درست ہے؟ کیا اب یہ ضروری نہیں ہو گیا ہے کہ ہم کم از کم بی۔ اے کی سطح تک اپنے روایتی طریقہ تدریس یعنی LECT-URE METHOD کے علاوہ زبان کے زبان کے ان طریقوں سے بھی کام لیں جن کے بغیر طلبہ کی لسانی صلاحیتوں میں کسی طرح اضافہ نہیں ہو سکتا؟

یہ تو وہ صورت حال ہے جس سے اردو ادب کی تعلیم دینے والے سب ہی اساتذہ دوچار ہیں۔ اب میں ایک دوسری ضرورت کی طرف بھی اشارہ کرنا چاہتا ہوں۔ ادھر حال میں ہماری بعض یونیورسٹیوں نے بی۔ اے اور ایم۔ اے کے ادبی نصابات کے علاوہ اردو زبان سکھانے والے ایسے سرٹیفکیٹ اور ڈپلوما کورسوں کا آغاز بھی کیا ہے جو خاص طور پر تدریس زبان سے تعلق رکھتے ہیں۔ جہاں تک اس یونیورسٹی کا تعلق ہے یہاں پہلے ہی بی۔ اے، بی۔ ایس۔ سی اور بی۔ کام کی سطح تک اردو کسی نہ کسی حیثیت سے ایک لازمی مضمون کے طور پر داخل نصاب ہے۔ اس قسم کے نصابات کا مقصد یہ ہے کہ بیرونی ممالک سے آنے والوں نیز ان ملکی طلبہ کو جو غیر اردو ہندی علاقوں سے تعلق رکھتے ہیں اردو زبان سکھائی جا سکے۔ ان کورسوں میں ایسے طلبہ کی تعداد بھی کم نہیں جو اگرچہ ہندوستانی بولنے والے علاقوں سے تعلق رکھتے ہیں لیکن ان کو کسی وجہ سے اردو پڑھنے کا اب تک کوئی موقع نہیں ملا۔ ان طلبہ کا ذخیرہ الفاظ محدود ہوتا ہے اور وہ اردو رسم خط سے بالکل واقف نہیں ہوتے۔ اس طرح ان تمام کورسوں کا تعلق خواہ وہ غیر ملکی طلبہ کے لئے ہوں یا ملکی طلبہ کے لئے بہر حال تدریس زبان سے ہے۔ اس

عطا کاکوی

ذاکر صاحب کی یاد

پابند اصول تھے جناب ذاکر — کانٹوں میں پھول تھے جناب ذاکر
جسکا علم و عمل کا دن رات رہا — اک شوق فضول تھے جناب ذاکر

تعلیم کے تھے نیّر اعظم ذاکر — تہذیب کے تھے ستون محکم ذاکر
گاندھی کے دست راست نہرو کے رفیق — انصاری و اجمل کے تھے ہمدم ذاکر

ذاکر سا ملن دوست کہاں کوئی ہوا — ہر رات کو دن علم کی خدمت میں رہا
خدمت کا صلہ اس کو نہ ملتا کیسے — رتبہ اس کو بلند ملنا تھا، ملا

شہرہ ذاکر کا ہند تا روم ہوا — کل تک زندہ تھا آج مرحوم ہوا
ثابت کیا خود اس نے عمل سے اپنے — جو قوم کا خادم ہوا مخدوم ہوا

محنت سے "جامعہ" کو سینچا اس نے — پودے کو بڑا شجر بنایا اس نے
جھک کر گرنا ہی چاہتا تھا یہ درخت — کاندھے سے دیا اس کو سہارا اس نے

ذاکر کو "جامعہ" کا بانی کہئے — "سید" کی طرح ان کی کہانی کہئے
سید نے علی گڑھ کی بنا ڈالی تھی — کیوں ان کو نہ "سرسید ثانی" کہئے

جس سے ملتے تھے خندہ رو ملتے تھے — مانند ساغر و سبو ملتے تھے
ہو جاتا تھا باغ باغ جو ملتا تھا — گلشن کی طرح برنگ و بو ملتے تھے

ادنیٰ خدمت سے خدمت اعلیٰ تک — انداز نہ اک لمحہ کبھی بدلا تک
سب سے ملتا وہ حسن اخلاق کے ساتھ — کچھ دوست نہیں ہیں معترف اعدا تک

برسوں تک علم و فن کے رہبر بھی رہے — جو تعلیم کے شمس و قمر بھی رہے
آخر میں ہند کی صدارت بھی ملی — پہلے یہ بہار کے گورنر بھی رہے

بے تاج کا بادشاہ ان کو کہئے — سرمایۂ عز و جاہ ان کو کہئے
جو کہئے بجا اگر حقیقت یہ ہے — تعلیم کے مہر و ماہ ان کو کہئے

سلسلے میں ہمیں کس طرح کے مسائل درپیش ہیں۔

اس سے پہلے بہ استثنائے فورٹ ولیم کالج کسی وقت بھی غیر ملکی زبان FOREIGN LANGUAGE کی حیثیت سے اردو کی تعلیم کا سوال ہمارے سامنے نہیں آیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے پاس نہ ایسی کتابیں موجود ہیں جو اردو کو غیر ملکی زبان کی حیثیت سے سکھانے میں معاون ہوں اور نہ ہم تدریس زبان کے ان جدید طریقوں سے واقف ہیں جو غیر ملکی طلبہ کو اردو زبان سکھانے کے سلسلے میں مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔ جہاں تک فورٹ ولیم کالج کے گرامر میتھڈ (GRAMMER METHOD) کا تعلق ہے وہ جدید نظریات تعلیم کی روشنی میں فرسودہ اور از کار رفتہ ہو چکا ہے۔ علم لسانیات کی ترقی کے ساتھ ساتھ تدریس زبان کے وہ سائنسی طریقے ایجاد ہو چکے ہیں۔ جن کی مدد سے سالوں کا کام مہینوں اور مہینوں کا کام ہفتوں میں پورا ہو سکتا ہے اور پہلے سے کہیں زیادہ بہتر نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ کیا ہم ان جدید طریقہائے تدریس سے واقف ہوئے بغیر اس نیک کام میں جو ہم نے اردو زبان کی ترویج و اشاعت کے لئے شروع کیا ہے کامیاب ہو سکتے ہیں؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس پر ہمیں سنجیدگی سے غور کرنا چاہئے۔ اس اجتماع میں جہاں خوش قسمتی سے ماہرین زبان اور ماہرین تعلیم دونوں ہی موجود ہیں اس مسئلہ کا حل تلاش کرنا کوئی دشوار کام نہیں۔

تدریس زبان کے جن مسائل کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے ان کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ تجویز بے محل نہ ہوگی کہ انجمن اساتذۂ اردو ایسے گرمائی مدرسوں (SUMMER SCHOOLS) کے قیام کا بندوبست کرے جہاں وہ اساتذہ جو تدریس زبان سے متعلق ہیں جدید طریقہائے تدریس سے واقفیت بہم پہنچا سکیں۔

تدریس زبان کے بعد اب میں آپ کی توجہ ان مسائل کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں جن کا تعلق تدریس ادب سے ہے تدریس ادب کے دو پہلو ہیں: تدریس نثر اور تدریس نظم۔ جہاں تک اردو کے نثری ادب کا تعلق ہے اس کی تعلیم دیتے وقت عام طور سے ہمارے پیش نظر یہ مقاصد ہوا کرتے ہیں۔

۱۔ طلبہ میں اردو نثر کے عہد بعہد ارتقا کا شعور پیدا کرنا۔

۲۔ ان کو مختلف اسالیب نثر سے روشناس کرانا اور تجزیاتی مطالعے کے ذریعے یہ صلاحیت پیدا کرنا کہ وہ ان اسالیب کی صحیح قدر و قیمت متعین کر سکیں۔

۳۔ طلبہ کو مختلف اصناف نثر سے متعارف کرانا اور ان کے حسن و قبح کو پرکھنے کی استعداد پیدا کرنا (اسی حسن و قبح کی پرکھ کو اصطلاحی زبان میں "تنقیدی شعور" کہا جاتا ہے)

اب دیکھنا یہ ہے کہ موجودہ طریقۂ تدریس یعنی LECTURE METHOD ان مقاصد کے حصول میں معاون ہوتا ہے یا نہیں؟ میرا یہ خیال ہے کہ سماجی مضامین مثلاً تاریخ، جغرافیہ، سیاسیات، سماجیات اور اقتصادیات وغیرہ کی تدریس کے لئے تو لیکچر کا یہ "پروقار" طریقہ کافی ہو سکتا ہے لیکن تدریس ادب کے سلسلے میں ہم صرف اسی طریقہ پر اکتفا نہیں کر سکتے۔ تدریس ادب کا نصب العین طلبہ کی معلومات میں محض اضافہ کرنا نہیں ہوتا، بلکہ یہاں بنیادی مقصد یہ ہوتا ہے کہ طلبہ اپنے ادبی ذوق کی نشوونما کر سکیں اور ان میں یہ صلاحیت پیدا ہو جائے کہ اپنے ادبی سرمائے کی قدر و قیمت کا تعین کر سکیں۔ عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ ہم لوگ اپنے ٹائم ٹیبل میں سے کچھ گھنٹے مجوزہ ٹیکسٹ کی تشریح کے لئے مخصوص کر دیتے ہیں اور کچھ اوقات اس لیکچر کے لئے مخصوص کر دیتے ہیں جو ہمیں متعلقہ مصنف کے فن پر دینا ہے۔ یہ لیکچر کبھی اصل ٹیکسٹ پڑھانے سے پیشتر اور کبھی ٹیکسٹ ختم کرانے کے بعد دیا جاتا ہے۔ اب غور کرنا یہ ہے کہ کیا متن کی تشریح اور تنقید کو اس طرح دو خانوں میں بانٹ دینا مناسب ہے یا نہیں؟۔ شاید آپ مجھ سے اس معاملہ میں اتفاق کریں کہ یہ تقسیم بے حد نقصان دہ ہے اور شاید اسی کا نتیجہ ہے کہ طلبہ میں وہ تنقیدی شعور (یعنی ذاتی پسندیدگی اور ناپسندیدگی کی صلاحیت) اور سچا ادبی ذوق پیدا نہیں ہوتا جس کی ہم ان سے توقع رکھتے ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ طلبہ استاد کے لیکچر نوٹس اور علمی تنقید کی چند کتابوں کو سامنے رکھ کر کچھ سوالات امتحان کے لئے تیار کر لیتے ہیں اور یہ جاننے کی بالکل کوشش نہیں کرتے کہ ان لیکچر نوٹس اور کتابوں میں جو تنقیدی اصطلاحیں آئی ہیں ان کا مفہوم کیا ہے۔ غرض کچھ بندھے ٹکے فقروں اور اصطلاحوں مثلاً سادگی، شگفتگی، روانی، ندرت بیان، بندش الفاظ، محاکات، حسن کاری، اسلوب آفرینی وغیرہ کو طوطے کی طرح رٹ کر وہ امتحان میں بہ آسانی کامیاب ہو جاتے ہیں اور وہ "تنقیدی شعور" جو ان میں مجوزہ ٹیکسٹ کے مطالعے سے پیدا ہونا چاہئے تھا ہرگز پیدا نہیں ہوتا۔ اس بگاڑ سے بچنے کا کیا طریقہ ہو سکتا ہے؟ یہ ایک مسئلہ ہے جس پر ہمیں غور کرنا چاہئے۔ اس مجمع میں ماشاءاللہ وہ صاحبان نظر تشریف رکھتے ہیں جن کو تدریس ادب کا ایک طویل تجربہ ہے۔ اس لئے یہ توقع کرنا بے جا نہ ہوگا کہ مسئلہ دشوار سہی لیکن اس کا حل تلاش کر لینا ناممکن نہیں۔ مجھ ایسے کم علم اور کم مایہ کے لئے اس سلسلے میں لب کشائی کرنا "چھوٹا منہ اور بڑی بات" کا مصداق ہوگا۔ خصوصاً ایک ایسے اجتماع میں جہاں میرے بہت سے استاد بھی تشریف رکھتے ہیں، کچھ حقیقی کچھ معنوی۔ وہاں میں یہ گستاخی نہیں کر سکتا کہ کوئی تجویز پیش کر کے مشہور مزاح نگار شوق بہرائچی کے اس مصرعہ کا مصداق ہوں کہ۔ ع

ہمیں سے سیکھی ہے رہنمائی　　ہمیں کو رستہ بتا رہے ہیں

ایسی صورت میں اگر ان بزرگ اساتذہ کو میرا مخاطب نہ سمجھا جائے تو البتہ اپنے نوجوان دوستوں سے یہ عرض کرنے کی جسارت کر سکتا ہوں کہ نثر پڑھانے کے لئے اگر لیکچر کے استقرائی طریقے (INDUCTIVE METHOD) کے بجائے تدریس کا استنباطی یا استخراجی طریقہ کار (DEDUCTIVE METHOD) اختیار کیا جائے تو

شاید زیادہ مناسب ہو۔ استنباطی طریقہ سے میری مراد یہ ہے کہ متن کی تشریح کے دوران ہی ایسے سوالات کئے جائیں جو طلبہ کو دعوت فکر دینے والے ہوں۔ ان سوالات کے ذریعے طلبہ کی توجہ اُن مخصوص الفاظ، فقرات، محاوروں، تشبیہوں، استعاروں اور علم بیان کے دوسرے وسائل کی طرف مبذول کرائی جائے جو مصنف کے مخصوص اسلوب کی نشاندہی کرتے ہیں۔ اس طرح استاد کو الگ سے مصنف کے فن پر لکچر دینے کی ضرورت باقی نہیں رہے گی، بلکہ خود متن کے مطالعے سے طلبہ میں وہ سچا تنقیدی شعور پیدا ہوگا جس کی ہم ادب کے ایک طالب علم سے توقع رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ تدریس ادب کا ایک اور طریقہ جس سے ترقی یافتہ ممالک میں کام لیا جا رہا ہے وہ ہے جس کو (GUIDED STUDY) کہا جاتا ہے۔ اس طریقۂ تدریس کے تحت جو مضمون یا افسانہ یا ناول پڑھانا ہوتا ہے اس کے مختلف پہلوؤں کو پیش نظر رکھتے ہوئے استاد ایک طویل سوالنامہ مرتب کر کے طلبہ میں تقسیم کر دیتا ہے۔ یہ سوالات طلبہ کو دعوت فکر دینے والے ہوتے ہیں اور کافی غور و فکر کے بعد اس طرح وضع کئے جاتے ہیں کہ زیادہ سے ایک جملے میں ہر سوال کا جواب دیا جا سکے اس طرح طالب علم کو داخلِ نصاب کتاب کے ہر ہر پہلو پر غور کرنے اور رائے دینے کا موقع ملتا ہے اور بالآخر یہ استنباطی طریقہ کار طلبہ کے تنقیدی شعور کو بروئے کار لانے میں بڑا مددگار ثابت ہوتا ہے۔

تدریس نثر کے بعد بیجا نہ ہوگا اگر اس دشواری کی طرف بھی اشارہ کر دیا جائے جو تدریس نظم کے دوران اساتذہ کو عام طور سے پیش آتی ہیں۔ وہ دشواری یہ ہے کہ ہمارے شعری سرمائے خصوصاً غزل، مثنوی، قصیدے، اور مرثیے میں جو علامتیں، استعارے، تلمیحیں اور علمی و فنی اصطلاحات استعمال کی گئی ہیں یا جن کا ذکر ہے اس سے دن بدن بیگانگی بڑھتی جا رہی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ استاد کو اشعار کے مطالب کی تشریح میں بڑی دشواری پیش آتی ہے۔ یہ خالص طور پر اساتذہ کا اجتماع ہے، اس لئے اس اعتراف میں کوئی قباحت نہیں کہ ایسے مواقع پر خود اساتذہ کو اپنی کم نظری کا احساس ہوتا ہے اور سوائے اس کے کوئی چارہ کار نہیں رہتا کہ ہم سرسری طور سے شعر کا کچھ الٹا سیدھا مطلب بیان کر کے آگے بڑھ جائیں۔ یہ ایک مسئلہ ہے جس کا ہم کو حل تلاش کرنا ہوگا۔ اس سلسلے میں میری ایک تجویز ہے اور وہ یہ انجمن اساتذۂ اردو ایک ایسی جامع مصور لغت (LITERARY ENCYCLOPAEDIA) کی اشاعت کا منصوبہ بنائے جس میں اردو ادب کے تمام کلاسیکی شعری سرمائے کو سامنے رکھ کر علامتوں، استعاروں، تلمیحوں، علمی و فنی اصطلاحات نیز قدیم معاشرت سے تعلق رکھنے والے تمام سازو سامان اور گزرے ہوئے دور کے تمام اوہام اعتقادات اور رسومات کی ایسی مکمل تشریح کی جائے جو نہ صرف طلبہ بلکہ اساتذۂ اردو کے لئے حوالے کی کتاب (REFERENCE BOOK) کا کام دے سکے۔ یہ کام یقیناً بہت بڑا ہے اور کوئی ایک شخص یا ایک ادارہ اسے انجام نہیں دے سکتا، البتہ اگر انجمن یہ ذمہ داری قبول کرے اور اس کام کے لئے کل ہند پیمانے پر ایک کمیٹی قائم کر دی جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ اساتذۂ اردو کی یہ اہم ضرورت پوری نہ ہو سکے۔

مقالے کے اختتام پر مناسب ہوگا کہ ان تجاویز کو ایک بار پھر دہرا دیا جائے جن کا اوپر ذکر کیا گیا۔ تاکہ آپ غور و فکر کے بعد کسی نتیجے پر پہنچ سکیں۔ وہ تجاویز یہ ہیں:

تدریس زبان کے جدید طریقوں سے واقفیت بہم پہنچانے کے لئے گرمائی مدرسوں (سمر اسکول) کا قیام۔

۲۔ تدریس نثر کے لئے موجودہ استقرائی طریقے کے بجائے استنباطی طریقے پر زور۔

۳۔ تدریس نظم کو زیادہ موثر بنانے کے لئے ایک جامع مصور ادبی لغت کی ترتیب و اشاعت۔

شفیق رئیسی

گلابوں کا مسیحا ـــــ ڈاکٹر ذاکر حسین

اے خاک پاک جامعہ اے فخر سروری
اے یادگار جلوۂ عہد پیمبری
دانش گہ دیار علی گڑھ کے نونہال
مضمر تھی تیرے عزم بغاوت میں رہبری
جنگل میں تونے علم کا گلشن کھلا دیا
کم مائگی کو دے کے متاع قلندری
کار جہاں تھا مثل عبادت ترے لئے
علم و ہنر کو دے گیا معیار برتری
فکر و خیال و نطق میں خونِ جگر کا رنگ
حسن عمل میں نکہت آداب دلبری
تصویر کو، گلاب کو، پتھر کو، شعر کو
حسن نگاہ تھی تری تہذیب آذری
ماتم گسار ہجر میں سارا جہان ہے
سارے جہاں کو آج ہے احساس بے سری
ہم کشتگان علم کا تری روح کو سلام
اے امتزاج اکبر و آزاد و بوذری

ہماری زبان

کو مضامین و مراسلات ارسال کرتے وقت یہ ملحوظ رکھیں کہ وہ ایک طرف لکھے ہوں۔

محمد انصار اللہ

مولوی محمد عظیم اللہ رخمی

مولانا محمد حسین آزاد کا تذکرہ "آب حیات" دنیائے اردو کا وہ حیرت انگیز کارنامہ ہے جس پہلو اور جس انداز سے دیکھئے اس کے اعجاز کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ "آب حیات" کا اگر بغور مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ اس کے مولف نے بیشتر قریب العہد بزرگوں کے حالات ان کے متعلقین اور تلامذہ سے لکھوائے ہیں اور ان حالات کو اپنے قلم اعجاز رقم سے ترکیب دے کر اس طرح مربوط و مسلسل کر دیا ہے کہ اگر خود آزاد نے جا بجا اعتراف نہ کیا ہوتا تو ہرگز کسی کو یقین نہ آتا کہ اس کتاب کے مختلف حصے الگ الگ لوگوں سے لکھوائے گئے ہیں۔ اس لحاظ سے آب حیات EDITING (تدوین) کا بہترین نمونہ ہے اور غالباً اب تک اردو میں اس سے بہتر کیا اس کے مرتبہ کا بھی کوئی دوسرا کارنامہ پیش نہیں کیا جا سکا ہے۔ "آب حیات" کے لئے کون کون سے حصے کن کن اہل قلم سے لکھوائے گئے اس پر تفصیلی بحث انشاء اللہ آئندہ کبھی کی جائے گی فی الوقت صرف ایک ایسی شخصیت کا تعارف کرانا مقصود ہے جس کو اگرچہ اب زمانے نے تقریباً فراموش کر دیا ہے اپنے زمانے میں اس حد تک امتیاز حاصل تھا کہ آزاد کی نگاہ انتخاب دبستان لکھنؤ کے مشہور ترین استاد شیخ امام بخش ناسخ کے حالات کے حصول کے لئے اسی پر پڑی اس کا نام ہے مولوی محمد عظیم اللہ رخمی

"تمہید شیخ امام بخش ناسخ کے حال کی" کے عنوان سے مولانا محمد حسین آزاد لکھتے ہیں:

> "بزرگان قدیم کی عمدہ یادگار مخدومی مولوی محمد عظیم اللہ صاحب ایک صاحب فضل و عاشق کمال غازی پور زمینیہ زمانیہ کے رئیس ہیں۔ اگرچہ بزرگوں کا حال بتفصیل معلوم نہیں مگر اتنا جانتا ہوں کہ نانی القضاۃ مفتی اسد اللہ صاحب کی ہمشیرہ یعنی شاہ اجمل صاحب کی نواسی سے ان کی شادی ہوئی۔ مولوی صاحب موصوف کے والد کی شیخ امام بخش ناسخ سے نہایت دوستی تھی۔ میرے دوستو! اگلے وقتوں کی دوستیاں کچھ اور دوستیاں تھیں۔ آج تمہارے روشنی کے زمانے میں ان کی کیفیت بیان کرنے کو لفظ نہیں ملتے جن سے ان کے خیالوں کا دلوں میں عکس جا دے۔

بقول استاد ذوق ؎

اب زبان پر بھی نہیں آتا کہیں الفت کا نام
اگلے مکتوبوں میں کچھ رسم کتابت ہو تو ہو

غرض جذب جنسیت اور اتحاد طبیعت ہمیشہ مولوی صاحب کے والد کو غازی پور سے لکھنؤ کھینچ کرلے جاتا تھا مہینوں وہیں رہتے تھے۔ مولوی صاحب کا پانچ برس کا سن تھا یہ بھی والد کے ساتھ ہوتے تھے۔ اسی وقت سے شیخ ناسخ کی خدمت میں رہے اور سالہا سال فیض حضوری سے بہرہ یاب ہوئے۔ رخمی تخلص انھیں نے عنایت فرمایا جس سے ۱۲۰۰ھ سال تخلص نکلتے ہیں۔ عربی فارسی کی کتب تحصیلی الہ آباد اور لکھنؤ میں حاصل کیں اردو فارسی کی انشا پردازی میں کئی جلد لکھ کر رکھ چھوڑے ہیں جانتے ہیں کہ ان کی نقل اب بالکل نکل گئی۔ ہوا مخالف ہے اس لئے نہ آپ گوشہ عافیت سے نکلتے ہیں نہ انھیں نکالتے ہیں عہد جوانی میں سرکار سے بھی بااقتدار اور معزز عہدے حاصل کئے۔ اب بڑھاپے نے پنشن خوار بنا کر خانہ نشین کر دیا ہے۔ بندہ آزاد کو اسی "آب حیات" کی بدولت ان کی خدمت میں نیاز حاصل ہوا۔ انھوں نے بہت حالات شیخ موصوف کے لکھ کر گرانبار احسان فرمایا جو کہ اب طبع ثانی میں درج ہوتے ہیں۔ آزاد ان کا صدق دل سے ممنون احسان ہے ہمیشہ عنایت ناموں سے ممنون فرماتے رہتے ہیں جن کے حرف حرف سے محبت کے آب حیات ٹپکتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ ہم لوگ اس زمانہ کے لئے بالکل اجنبی ہیں۔ نئی روشنی والے کہتے ہیں روشنی نہیں، وہ روشنی نہیں۔ جناب رخمی اور بندہ آزاد کی آنکھوں سے کوئی دیکھے کہ دنیا اندھیر ہے ؎

مرا ز یک نگاہ آشنا از کسی نہ یابم
جہاں چوں نرگستاں ہے تو شہر کوری باشد

اب تک زیارت نہیں ہوئی ہے مگر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کوئی انجان آدمی ایک نئے ملک میں جا پڑے جہاں وہ نہ کسی کی سمجھے نہ کوئی اس کی اور وہ ہکا بکا ایک ایک کا منہ دیکھے اسی طرح وہ بھی آجکل کے لوگوں کا منہ دیکھ رہے ہیں۔ کہاں ناسخ و آتش کے مشاعرے اور کہاں کیٹیوں کے جلسے شیخ صاحب اور خواجہ صاحب کے حالات جو انھوں نے لکھ کر بھیجے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ آنکھوں کے آنسو تھے۔ حرفوں کے رنگ میں بہہ نکلے ہیں۔ یہ درد کوئی آزاد کے دل سے پوچھے کہ جب شیخ ابراہیم ذوق کا نام آتا ہے چھاتی پر سانپ لوٹ جاتا ہے ؎

اہ یہ غلط فہمی نہ ہو کہ میں آب حیات کی ہر روایت کو درست اور صحیح بھی تسلیم کرتا ہوں۔ مجھے اعتراف ہے کہ اس میں اکثر غلط بلکہ بے حقیقت باتیں جا بجا لکھی ہیں لیکن آزاد کے یہ خیالی "طوطے مینا" بہت اہم ہیں کہ ان سے آزاد کے زور استدلال اور زور قلم کا بہترین ثبوت ملتا ہے۔

زبانِ بلبل اگر با منست سرپاری ست
کہ با دو عاشقِ زارم کہ در بازاری ست

شیخ ناسخ کا حال لکھتے لکھتے لکھتے ہیں۔

"کیا کہوں کہ میرے حال پر کیسی شفقت فرماتے تھے۔ دو دو دیوان خود لکھ کر مجھے دئے ایک مہر عقیق پر کھدوا کر مجھے دی۔ اب تک موجود ہے"

رنجی سلمہ اللہ نے جونپور اور غازی پور وغیرہ کے حالات بھی بھیجے ہیں، جن کی بدولت دربار اکبری ہمیشہ شکرگزار رہے گا۔ خدا کرے کہ جلد وہ مرقع سج کر اہل نظر کی پیش گاہ میں جلوہ گر ہو۔"

آزاد کے قلم کی سحر نگاری بھی ایک بات ہے لیکن اس طویل اقتباس میں انھوں نے جن جذبات کا اظہار کیا ہے وہ حقیقی ہیں۔ بدلے ہوئے حالات کا جس شدت سے ان پر اثر تھا اس تحریر سے اس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں۔ یہ حالات کی ستم ظریفی ہی تو تھی کہ کل تک جن کی استادی کا سکہ چلتا تھا ان کی منظومات کو شاعری کے دائرے سے بھی خارج کرنے کی کوشش کی جانے لگی تھی۔ کل تک جو شاعری شرافت کا سرمایہ تھی اب اسے بے کاروں کا مشغلہ کہا جانے لگا تھا کبھی اسے مخرب اخلاق کہا جاتا تھا اور کبھی محض الفاظ کی بازی گری بتایا جاتا تھا۔ آزاد ہوں یا رنجی دونوں بزرگوں کی روایتوں اور حکایتوں کو سینے سے لگائے ہوئے تھے رنجی سے مایوس ہو کر "خانہ نشین" ہو گئے لیکن آزاد اپنے قلم کی طاقت سے آخر تک زمانہ کا مقابلہ کرتے رہے۔

آزاد نے رنجی کے سسرالی بزرگوں میں شاہ اجمل کا بھی ذکر کیا ہے یہ وہی بزرگ ہیں جن کے نام سے الہ آباد میں "دائرہ شاہ اجمل" اب تک مشہور و منسوب چلا آتا ہے۔ ان کے خاندان سے ناسخ کے جیسے مراسم تھے ان کا اندازہ ناسخ کے اس ایک شعر سے کیجئے ؎

ہر پھر کے دائرے ہی میں رکھتا ہوں میں قدم
آئی کہاں سے گردش پرکار پاؤں میں

شاہ اجمل کے خاندانی بزرگوں میں شیخ محمد افضل الہ آبادی کے حالات میں معلوم ہوتا ہے کہ:

"اصل وطن سید پور (توابع غازی پور زمانیہ) تھا، وہیں پیدا ہوئے، بچپن میں جونپور چلے گئے پھر الہ آباد میں سکونت اختیار کی اور وہیں انتقال کیا۔" (بحوالہ تذکرہ علمائے ہند ص۱۸۵)

رنجی کا وطن بھی سید پوری تھا آزاد نے غازی پور زمانیہ لکھا ہے، اس سے قصبہ زمانیہ نہیں بلکہ ضلع غازی پور مراد ہے چنانچہ لالہ سری رام نے بھی رنجی کے حال میں لکھا ہے:

"رنجی ناظم و ناثر کہن سال، نکتہ رس، بے نظیر، مولوی عظیم اللہ رنجی سید پوری، شاگرد رشید شیخ ناسخ لکھنوی، غازی پوری کے رؤسا میں سے تھے"

(خمخانہ ۳/۲۷۲)

عین ممکن ہے کہ شاہ اجمل سے سسرالی رشتے کے علاوہ رنجی کا خاندانی تعلق بھی رہا ہو، اور اسی خاندانی تعلق کی بنا پر رنجی کی وہاں شادی ہو سکی ہو۔ رنجی کے برادر نسبتی مفتی اسد اللہ کا حال مولوی رحمان علی خاں بہادر نے اس طرح لکھا ہے:

"مفتی محمد اسد اللہ الہ آبادی ابن مفتی کریم اللہ، مولانا فضل رسول بدایونی کے شاگرد جس زمانے میں فتحپور میں مفتی عدالت تھے تو جامع الادراق نے شرح عقاید نسفی اور مشکوٰۃ شریف ان سے سبقاً سبقاً پڑھی پھر عدالت آگرہ میں قاضی القضاۃ اور آخر میں جونپور کے صدر الصدور ہوئے بتاریخ ۲۳ جمادی الاول بروز دو شنبہ ۱۳۰۰ھ/۱۸۸۲-۸۳ء جان جان آفریں کے سپرد کی جونپور کے محلہ چتر ساری میں دفن ہوئے۔ مفتی اسد اللہ ۱۲۳۰ھ/۱۸۱۴-۱۵ء میں پیدا ہوئے" (علمائے ہند ص۱۰۹)

بظاہر رنجی اور مفتی اسد اللہ کی عمروں میں بہت زیادہ تفاوت نہ رہا ہوگا۔ لالہ سری رام[۱] نے رنجی کے سلسلہ حالات میں لکھا ہے:

"ان کے والد شیخ امان اللہ طوفان، ناسخ مرحوم کے دلی دوست و رفیق تھے۔ یہ خود بڑے مشاق اور صاحب تصانیف کثیرہ تھے۔ اوائل سن تمیز میں الہ آباد اور لکھنؤ جا کر تحصیل علم کی۔ اسی (۸۰) برس سے زیادہ عمر پا کر چار پانچ سال ہوئے انتقال کیا۔ شیخ ناسخ کے حالات شمس العلما آزاد کو آپ ہی کی وساطت سے دستیاب ہوئے ایام ضعیفی میں بھی برابر مشغلہ سخن کو جاری رکھتے تھے۔ رنجی تخلص سے آپ کی شاعری کا ابتدائی سال نکلتا ہے، بڑے جہاں دیدہ، قابل، طباع، خلیق بزرگ تھے بڑی دقت سے چند غزلیں ہاتھ آئیں"

(خمخانہ ۳/۲۷۲)

(باقی آئندہ)

[۱] یوپی میں ضلع فتحپور (بھی فتحپور ہنسوا) کے نام سے مشہور ہے، ہنسوا ضلع فتحپور کی ایک تحصیل ہے۔ ایسے مقامات پر قصبہ کے لئے صرف قصبہ کا نام لیتے ہیں یعنی ہنسوا سے مراد تحصیل ہنسوا ہے لیکن فتحپور ہنسوا سے ضلع فتحپور مراد ہوگا

[۱] خمخانہ جاوید کی تیسری جلد ۱۳۳۵ھ/۱۹۱۷ء میں چھپ کر شائع ہوئی تھی اس کے آخر میں جو تعلقات ہیں ان سے ۱۹۱۲ء سے ۱۹۱۵ء تک کے زمانے میں اس کا مکمل ہونا ظاہر ہوتا ہے۔ قیاس غالب ہے کہ رنجی کے حالات بھی کم و بیش اسی زمانے میں لکھے ہوں گے۔

مراسلات

ڈاکٹر اقبال اور "مرزا غالب"

ڈاکٹر اقبال کے مجموعۂ کلام "بانگ درا" میں "مرزا غالب" کے عنوان سے ایک نظم مندرج ہے جو کہ پانچ بندوں پر مشتمل ہے ۱۹۵۲ء میں کراچی سے جناب محمد انور حارث نے "رخت سفر" کے نام سے ڈاکٹر اقبال کے غیر مدوّن کلام کا ایک مجموعہ شائع کیا ہے۔ اس مجموعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابتداً اقبال کی نظم "مرزا غالب" میں ایک بند اور شامل تھا جو اب "بانگ درا" میں محذوف ہے۔ اس کے علاوہ دو ایسے شعر بھی ہیں جنھیں ڈاکٹر اقبال نے باقی رکھا ہے، کچھ ترمیم کی ہے۔

قارئین "ہماری زبان" کی دلچسپی کے لئے یہ بند اور غیر اصلاح شدہ اشعار درج ذیل ہیں۔

محذوف بند

سوزِ دلِ کلکِ تصور کا ترا دیوانہ ہے یا کوئی تفسیر رمزِ فطرتِ انساں ہے یہ
نازشِ موسیٰ کلامی ہائے ہندوستاں ہے یہ نورِ مضمونِ دل افروزِ سخن داناں ہے یہ

"نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا"
"کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا"

اصل شعر

(۱) دید تیری آنکھ کو اس حسن کی منظور ہے
صورتِ روحِ رواں ہر شے میں جو مستور ہے

موجودہ اصلاح شدہ شکل

(۱) دید تیری آنکھ کو اس حسن کی منظور ہے
بن کے سوزِ زندگی ہر شے میں جو مستور ہے (بند اوّل شعر ۲)

(۲) گیسوئے اردو ابھی منت پذیرِ شانہ ہے
شمع یہ جو مندۂ دل سوزیٔ پروانہ ہے

(۲) گیسوئے اردو ابھی منت پذیرِ شانہ ہے
شمع یہ سودائی دل سوزیٔ پروانہ ہے (بند ۵ شعر ۲)

(ملاحظہ فرمائیے "رخت سفر" مرتبہ محمد انور حارث کراچی، جنوری ۱۹۵۲ء، صفحات ۸ و ۹) (سید حامد حسین)

ڈاکٹر ذاکر حسین کی تصنیفات کی ضرورت

میں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب مرحوم صدر حکومت ہند کے کچھ حالات مرتب کر رہا ہوں۔ اس سلسلہ میں مجھے ان کی تالیفات و تصنیفات کی مکمل فہرست کی ضرورت ہے۔ بہت ہی مختصر تفصیلات کے ساتھ۔ میں نہایت ہی شکر گزار ہوں گا اگر ناظرین کرام میں سے کوئی صاحب یہ فہرست مجھے بھیج دیں گے یا ہماری زبان میں شائع فرما دیں گے۔ (شیخ محمد اسماعیل پانی پتی ۱۰۔ رام گلی نمبر ۳ لاہور)

انجمن ترقی اردو شاخ دہلی کی سالانہ رپورٹ

دہلی انجمن ترقی اردو دہلی کا سالانہ جلسہ جو ۲۰ر اپریل کو اردو پارک میں منعقد ہوا اس میں محترمہ حمیدہ سلطان جنرل سکریٹری شاخ دہلی نے سالانہ رپورٹ پیش کی جس کا متن درج ذیل ہے۔

دلی میں اردو کا مسئلہ سنہ ۱۹۵۶ء میں شدت سے سامنے آیا جب دلی اسمبلی کو توڑ دیا گیا۔ اسمبلی کی زبان کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں اردو کو علاقائی ثانوی سرکاری زبان قرار دینے کی سفارش کی تھی اس رپورٹ کو مرکزی وزارت داخلہ نے اپنی فائلوں میں محفوظ کر لیا۔ حالانکہ دلی والوں کی زبان بلا قید مذہب و ملت اردو ہی ہے۔ جو لوگ پنجاب سے یہاں سنہ ۱۹۴۷ء میں پہنچے ان کے لئے بھی کاروبار اور لکھنے پڑھنے کی زبان اردو ہے۔ اس لئے دلی میں کوئی اردو کا مخالف نہیں ہے۔ سابق اسٹیٹ اسمبلی نے ہندی کے ساتھ اردو کو بھی سرکاری درجہ دیا تھا۔ زبان کمیٹی میں ہندو مہاسبھا کے صدر، ہندی ساہتیہ سمیلن اور دلی یونیورسٹی کے شعبہ ہندی کے صدر بھی شامل تھے۔ ان سب نے اتفاق رائے سے یہ رپورٹ تیار کی تھی جس کو وزارت داخلہ نے بالکل نظر انداز کر دیا۔

انجمن ترقی اردو دلی کے اراکین برابر اردو تحریک کے سلسلہ میں وزیر اعظم اور وزیر داخلہ سے ملاقاتیں اور خط و کتابت کرتے رہتے ہیں لیکن نتیجہ تا حال کچھ نہیں نکلا حالانکہ آئین میں درج قومی زبانوں میں اردو بھی شامل ہے۔ لیکن وہ ان تمام حقوق سے محروم ہے جو اور تمام زبانوں کو حاصل ہیں یہ بات بڑی افسوسناک ہے کہ ہماری سیکولر گورنمنٹ اردو کے معاملہ میں تعصب برت رہی ہے۔ حالانکہ دلی اردو کی جنم بھومی ہے دلی کے سب کانگریسی رہنما اردو کے حق میں ہمیشہ پرزور تقاریر کرتے رہے اور مرحوم پنڈت نہرو نے ۱۹۵۹ء میں اپنے ایک خط میں صدر انجمن ترقی اردو دلی، پنڈت سندر لال سے اردو کو اس کا جائز مقام دلانے کا وعدہ کیا لیکن مرکزی حکومت کا رویہ جوں کا توں رہا۔ ہم نے بھی ہمت نہیں ہاری۔ کبھی وزیر اعظم سے مل کر گفتگو کی کبھی وزیر داخلہ کا دروازہ کھٹکھٹایا لیکن ہمارے انصاف پسند جمہوریت کے علمبردار رہنما اردو کے معاملہ میں تا حال بالکل بے نیاز ہیں حالانکہ دلی میں سابق میونسپل کمیٹی اور حال دلی کارپوریشن میں اردو کی علاقائی حیثیت کو باقاعدہ تسلیم کیا گیا تھا اور اس وقت کے میئر کارپوریشن مرحوم لالہ شام ناتھ ہمیشہ پرجوش طریقے سے اردو کی حمایت کرتے رہے لیکن اس تمام حوصلہ افزائی کے باوجود یہ حقیقت نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ اردو کا مستقبل تاریک ہے اور نئی نسل اردو سے بیگانہ ہے یہ بہت بڑا ظلم ہے اپنی مادری زبان سے بچوں کو محروم کر دیا جائے کہیں بھی کبھی بھی کسی حکومت نے ایسا نہیں کیا۔ دلی کے لوگ حکومت

کے اس سلوک سے بیزار اور مایوس ہیں۔ یہاں کے رہنے والوں کا عام مطالبہ ہے کہ دلی میں ہندی کے ساتھ اردو کو بھی سرکاری طور پر دفتر کچہریوں نیز سرکاری کاموں کے لئے استعمال کیا جائے۔ دلی کی فضا اردو کے لئے بہت سازگار ہے۔ یہاں کی ہواؤں میں غالب اور ظفر کے نغمے اب بھی گونج رہے ہیں۔

مولانا آزاد نے اپنی وفات سے ایک ہفتہ قبل انجمن ترقی اردو کی کانفرنس میں پنڈت نہرو کی موجودگی میں اسی جگہ بیٹھ کر یہ فرمایا تھا کہ اردو کا ہندی سے کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ ہندی کی سرکاری پوزیشن تسلیم کر لی گئی ہے اس لئے اردو کا حق اس کو ملنا چاہئے۔ لیکن یہ حق ابھی تک اردو کو نہیں ملا۔ اور اپنی حکومت میں وہ بے گھر اور بے در تاحال بھٹک رہی ہے۔ حالانکہ دلی میں آج بھی چھپنے والے اردو اخبار و رسائل کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ یہاں کے ہر گلی اور محلے میں ادبی نشستیں اور مشاعرے ہوتے ہیں۔ یہ شعر و ادب کی سرزمین ہے۔ حکومت کو خدا جانے کیا ضد ہے جو اردو کے مسئلہ کو حل نہیں کرتی۔ اندرا جی کے وزیر اعظم ہونے کے بعد جنوری سنہ ۱۹۶۶ء میں انجمن ترقی اردو دلی کا ایک وفد ملا۔ تو انھوں نے وعدہ کیا کہ دلی کے ذمہ داران حکومت سے مل کر کوئی فیصلہ کریں گی۔ پھر ۹ مارچ سنہ ۱۹۶۹ء کو انجمن ترقی اردو کی مجلس عاملہ نے جو ۲ مارچ کو جو ریزولوشن اپنی میٹنگ میں پاس کیا تھا وہ میں نے دیا۔ اس ریزولوشن میں یہ کہا گیا ہے کہ حکومت کو چاہیئے کہ غالب صدی منانے کے ساتھ غالب جس زبان کا شاعر تھا اس کی بھی علاقائی حیثیت دلی میں تسلیم کرے اس کے بعد دوسرا خط ۱۴ اپریل کو یاددہانی کے لئے بھیجا ان دونوں خطوں کے جواب میں وزیر اعظم کے جواب میں سکریٹری نے لکھا کہ ہم نے آپ کے خطوط وزارت داخلہ کو بھیج دیئے ہیں آپ اس سلسلے میں وزارت داخلہ سے معلوم کیجئے۔ یہ جواب مایوس کن ہے۔ کیونکہ وزیر داخلہ بھی پہلے کی طرح ٹال مٹول کا سلسلہ رکھیں گے سمجھ میں نہیں آتا کہ اردو کی کشتی کو کس طرح پار لگایا جائے۔ آزادی کے بعد بیس سال سے یہ تعصب کے خوفناک طوفان میں برابر ہچکولے لے رہی ہے ہم نے ہمت نہیں ہاری لیکن خود اردو والے کاش بیٹھ جانے کو ہی تیار ہوں تو دلی میں اردو کو علاقائی زبان منوانا مشکل نہ ہوگا۔ لالہ شام ناتھ جب وہ پریزیڈنٹ میونسپل کمیٹی تھے ایک تجویز کے ذریعے انھوں نے اردو کو کارپوریشن کی دوسری زبان تسلیم کرایا تھا۔ اس تجویز پر جو تقاریر ہوئیں ان میں یہ صاف ظاہر تھا کہ اردو کو دلی میونسپل کمیٹی میں جو بعد کو کارپوریشن ہوگئی بدستور استعمال کیا جائے گا اور ہندی انگریزی کی جگہ لے گی۔ لالہ شام ناتھ جب تک دلی کارپوریشن کے ممبر رہے اس پر عمل ہوتا رہا لیکن کارپوریشن سے ہٹنے کے بعد دلی کو بڑا نقصان پہنچا کہ ان کے جانشینوں نے تجویز کا مفہوم بدل دیا۔ اور اردو کو صرف ترجمہ تک محدود کر کے رکھ دیا۔ اب دعوت نامے تک کارپوریشن اور دلی اسٹیٹ کے ہندی میں آتے ہیں حالانکہ کارپوریشن اور اسمبلی کے فیصلوں کے مطابق ہندی کے ساتھ اردو میں بھی ہونا چاہئے۔ اور خط و کتابت میں بھی اردو کا استعمال ان دونوں جگہ ہونا ضروری ہے۔ اس طرح وہ پڑھا لکھا طبقہ جو ہندی سے اچھی طرح واقف نہیں اردو جانتا ہے اس کے لئے بڑی مشکلات ہیں۔ ہمارے دفتر میں یہ بھی شکایت آئی ہے کہ لوگوں کو اب کچہریوں میں ہندی میں درخواست دینے کے لئے مجبور کیا جاتا ہے اور اس طرح بھی اردو جاننے والوں کو نقصان پہنچتا ہے اور ان کے لئے کام کرنا اور اپنا پیٹ پالنا مشکل ہوتا ہے۔ زبان کے ساتھ روزی کا بھی مسئلہ ہے یہ حکومت کی بے رحمی ہے کہ وہ اردو کو بالکل ختم کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ اور اردو والوں کو زندہ رہنے کا حق بھی دینا نہیں چاہتی۔ باوجود مشکلات کے انجمن کے علمی ادبی کام بھی اس سال چلتے رہے ہمارا سب سے اہم ادبی کام ہے علامہ پنڈت برجموہن کیفی کی قابل قدر تصنیف منشورات کی اشاعت جو بازار میں بالکل نہیں تھی اور دوسرا کام ہے "صبح" کا نہرو نمبر وغیرہ۔ ہمارا ادبی مجموعہ بیس سال کے نظم و نثر کے اردو ادب کا جائزہ جس کو صف اول کے ادیبوں نے ڈاکٹر تارا چند کی نگرانی میں تیار کیا ہے مرکزی حکومت کے کلچرل ڈیپارٹمنٹ کی امداد سے کتابت کے آخری مراحل سے گزر رہا ہے۔ وزارت ثقافت سے مزید امداد ملتے ہی چھپ جائے گا۔ اس سال دلی حکومت کی ناانصافی کی وجہ سے انجمن مالی مشکلات میں مبتلا ہے۔ انجمن کو سنہ ۱۹۵۱ء سے دلی اسٹیٹ کا محکمہ تعلیم جناب شنکر پرشاد کی توجہ سے جو اس وقت کے چیف کمشنر تھے ایک ہزار سالانہ دیتا رہا اور سنہ ۱۹۶۰ء جب رسالہ "صبح" نکلا دو ہزار سالانہ برابر ملتا رہا سنہ ۱۹۶۶ء میں چھ سو ملے تھے ہم نے بقایا چودہ سو کا تقاضا کیا تو ۱۹۶۷ء میں دو ہزار ملے۔ سنہ ۶۸-۱۹۶۷ء میں بقایا چودہ سو دسمبر میں مل گئے لیکن ۶۹-۱۹۶۸ء کی گرانٹ میں ہمیں پانچ سو کی مارچ کے پہلے ہفتے میں منظوری کی اطلاع ملی تھی جس کو میں نے واپس کر دیا اور پوری دو ہزار کی رقم کا مطالبہ کیا لیکن تاحال دلی حکومت نے اس سلسلہ میں کوئی اطلاع نہیں دی یہ صورت حالات بے حد افسوسناک ہے کہ دلی کی زبان اردو اور دستور ہند کی چودہ منظور شدہ زبانوں میں سے ایک زبان کے ساتھ ایسی ناانصافی برتی جائے ہم حکومت سے بھیک نہیں مانگتے اپنا حق مانگتے ہیں۔ دو ہزار کی قلیل رقم دینے میں بھی دلی اسٹیٹ کا محکمہ تعلیم اب حیلے حوالے کرتا ہے حالانکہ دلی کی شاخ اپنی ہمت سے بڑھ کر کام کرتی ہے سہ ماہی "صبح" کا تازہ پرچہ گرانٹ نہ ملنے کے سبب نہیں نکل سکا۔ اس کا ہمیں افسوس ہے۔ میں جناب مصطفیٰ رشید شیروانی صاحب کا شکریہ اپنی اور اراکین مجلس عاملہ کی جانب سے ادا کرنا ضروری سمجھتی ہوں جو برابر اپنی فراخ حوصلگی سے ہماری مالی مشکلات کو کم کرتے ہیں۔ اس سال بھی انھوں نے ہزار روپے ہمیں عنایت کئے اس کے علاوہ علی منزل کا کرایہ بھی ہماری آمدنی کا ذریعہ ہے۔ انجمن ترقی

اردو نے اس سال علی منزل کا ٹرسٹ بھی بنا دیا ہے۔ ٹرسٹ کے صدر جناب مصطفےٰ رشید شیروانی ہیں۔ ٹرسٹ کا حساب کتاب الگ بنک میں رکھا جائے گا۔

شاخوں کی رپورٹ

شہری شاخ دلی نے کارپوریشن اور ایڈمنسٹریشن کے تمام پرائمری اسکولوں کا سروے کیا۔ اردو کے استادوں کے اعداد و شمار فراہم کئے۔ کتابیں دیکھیں اور ہندی ساہتیہ ونگیان کے اردو ایڈیشن چھپوانے کا مطالبہ کیا اور ایڈمنسٹریشن اور کارپوریشن کو یادداشت مع گوشوارہ معلومات پیش کیں اردو کے استادوں کے تقرر کے لئے مطالبہ کیا۔ اردو کے کئی استاد شہری شاخ کی کوشش سے رکھے گئے لیکن اب بھی اردو کے اور استادوں کی پرائمری اسکولوں میں ضرورت ہے۔ ٹیچرس ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ میں بھی شاخ کی کوشش سے داخلے ہوئے۔ اردو کے سلسلہ میں شہری شاخ کی کارگزاری قابل داد ہے جس کے سکریٹری بنارسی لال ہیں ہماری اور چار شاخوں سے صرف شاہدرہ شاخ نے اپنے کاموں کی رپورٹ دی ہے۔ شاہدرہ شاخ کے سکریٹری قدیر احمد بھی سرگرم کارکن ہیں اپنے علاقے میں برابر ماہانہ ادبی نشستیں اور مشاعرے کرتے رہتے ہیں لیکن باوجود بار بار تقاضے کے نئی دلی شاخ، جامعہ نظام الدین شاخ اور مغربی دلی شاخ کی رپورٹ نہیں ملی۔ اتنا ہی معلوم ہو سکا کہ جامعہ شاخ نے بھی کچھ ادبی نشستیں کی ہیں لیکن نئی دلی شاخ اور مغربی دلی کی شاخ بالکل خاموش ہیں۔

(حمیدہ سلطان احمد)

ریسرچ ایسوسی ایشن شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی کا جلسہ تعزیت

علی گڑھ:۔ ریسرچ ایسوسی ایشن شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی کا ایک تعزیتی جلسہ بتاریخ ۴ مئی کو زیر صدارت پروفیسر آل احمد سرور منعقد ہوا جس میں شعبہ کے اساتذہ اور طلبہ نے شرکت فرمائی۔ جلسہ میں ڈاکٹر ذاکر حسین صدر جمہوریہ ہند کی وفات پر گہرے رنج و غم کا اظہار کیا گیا اور مندرجہ ذیل تجویز پاس ہوئی ریسرچ ایسوسی ایشن شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا یہ جلسہ ڈاکٹر ذاکر حسین صدر جمہوریہ ہند کی اچانک وفات پر اپنے انتہائی رنج و غم کا اظہار کرتا ہے اور ان کی وفات کو ملک و قوم کے لئے ایک ایسا نقصان سمجھتا ہے جس کی تلافی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

ذاکر صاحب نہ صرف ایک بہت بڑے رہنما، قومی معمار، معلم، مدبر، مفکر اور مصلح قوم تھے بلکہ وہ ایک بلند پایہ مصنف اور ادیب بھی تھے انھوں نے نہ صرف اردو میں افلاطون کے شاہکار ریاست کا ترجمہ کیا اور اس پر ایک گراں قدر مقدمہ لکھا بلکہ اقتصادی اور تعلیمی موضوعات پر بھی گرانقدر تصانیف چھوڑیں انھوں نے بچوں کے لئے کہانیاں بھی لکھیں اور غالب اور حالی پر اپنے مخصوص اسلوب میں اظہار خیال کیا ان کی نثر میں ان کی فکر کی گہرائی، ان کی شخصیت کا گداز اور ان کی طبیعت کی رنگینی تینوں کا عکس ملتا ہے۔ ان کا اسلوب نثر کا ایک قابل قدر اسلوب ہے۔

ذاکر صاحب شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے گہرا تعلق رکھتے تھے۔ وہ شعبۂ اردو کے ممبر بھی رہے ہیں جب وہ اس یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے تو انھوں نے شعبے کے علمی و ادبی منصوبوں کے لئے وسائل مہیا کرانے میں مدد دی اور اس کی توسیع پر خاص توجہ کی اور بعد میں بھی وہ اس شعبے کے فروغ میں دلچسپی لیتے رہے اور مناسب مشوروں سے سرفراز کرتے رہے۔

جامعہ ملیہ نے اردو ادب کی جو خدمت کی ہے وہ دراصل ذاکر صاحب کی ذاتی دلچسپی اور رہنمائی کا نتیجہ ہے وہ انجمن ترقی اردو ہند کے صدر بھی رہے ہیں اور آزادی کے بعد انجمن کی حیات نو اور اس کا استحکام انھیں کی کوششوں کی وجہ سے ممکن ہو سکا۔ یہ جلسہ ذاکر صاحب کے لئے دعائے مغفرت کرتا ہے اور ان کے پسماندگان سے گہری ہمدردی کا اظہار کرتا ہے۔

ایوانِ اردو میں جلسۂ تعزیت ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم

حیدرآباد۔ اتوار ۱۰ مئی کی شام ادارہ ادبیات اردو کی طرف سے ایوان اردو میں صدر ہند ذاکر حسین کی وفات حسرت آیات پر جلسۂ تعزیت منعقد ہوا۔ سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ جناب بدرالدین طیب جی نے اجلاس کی صدارت فرمائی۔ ایوان اردو کے نمائندہ اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے پروفیسر سید محمد صاحب سابق ریڈر شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ نے ڈاکٹر ذاکر حسین کی شخصیت، سوانح اور مرحوم صدر کے علمی و ادبی کاموں پر تفصیل سے روشنی ڈالی اور کہا کہ ذاکر صاحب کے والد مولوی فدا حسین سالار جنگ اول کے زمانے میں وارد حیدرآباد ہوئے اور تجارت کرنے لگے، سالار جنگ نے ان کی ذہانت کو تاڑ لیا تھا موصوف نے نواب صاحب کے

مشورہ کو قبول کرکے جوڈیشنل امتحان کامیاب کیا اور وکالت شروع کی۔ قانونی رسالہ جاری کیا قانون پر کتابیں چھاپیں اور "مطبع آئین دکن" قائم کیا۔ ذاکر صاحب کے والد کا ۲۹ سال کی عمر میں ۱۹۰۷ء میں بمقام حیدرآباد انتقال ہوا۔ پروفیسر سید محمد نے کہا کہ ذاکر صاحب حیدرآباد میں پیدا ہوئے انہیں کے محلہ بیگم بازار میں بچپن گزرا اور انھوں نے حیدرآباد کے ریذیڈنسی اسکول میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ پروفیسر سید محمد نے کہا کہ ذاکر صاحب صدارت ہند کے منصب جلیلہ پر فائز رہنے کے باوجود اپنی مادر علمی علی گڑھ کو کبھی نہ بھولے وہ ایک صحیح محب وطن اور سچے اور شریف انسان کی حیثیت سے اپنے نصب العین کی تکمیل کرگئے۔ جناب ضیاء الدین احمد شکیب ایم اے علیگ نے ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کی شخصیت اور خدمات کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ "انھیں ذاکر صاحب کو اس وقت دیکھنے کا موقع ملا جب وہ علی گڑھ کے وائس چانسلر تھے۔ ذاکر صاحب مختلف اور متضاد مکتب خیال کے طالب علموں کو سوچنے سمجھنے اور عمل کرنے کی پوری آزادی فراہم کرتے تھے۔ ممتاز ماہر تعلیم پروفیسر سید علی اکبر صاحب صدر ادارۂ ادبیات اردو نے ذاکر صاحب کی عظیم خدمات اور جذبۂ وطن دوستی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ" ۱۹۲۰ء میں قیام برلن کے زمانہ میں ہم ہندوستانیوں نے تحریک آزادیٔ ہند کی خاطر ایک انجمن قائم کی تھی جس کے صدر ڈاکٹر ذاکر حسین تھے۔ ذاکر صاحب قوم پرست قائد اور گاندھی جی کے پیرو ہی نہیں بہت بڑے ماہر تعلیم بھی تھے جامعہ ملیہ اسلامیہ نے محدود وسائل کے باوجود آج جو مقام بنایا ہے اس کے پس پردہ ساری کوششیں اور توانائیاں ذاکر حسین صاحب کی محنت و ایثار کا نتیجہ ہیں۔ پروفیسر سید علی اکبر نے کہا کہ ادارہ ادبیات اردو سے مرحوم صدر کو قریبی لگاؤ رہا ہے وہ ادارے کے علمی کاموں اور اس کی ترقی سے مسرور ہوا کرتے تھے۔ اپنے آخری دورۂ حیدرآباد میں ڈاکٹر ذاکر حسین نے ایوان اردو کا تفصیلی معائنہ فرمایا اور اس کے کاموں پر اطمینان کا اظہار کرکے ہمارے حوصلے بلند کئے ہیں۔ اسکے بعد مغنی تبسم، وقار خلیل، صلاح الدین نیر، علی سرور اور فکری بدایونی نے ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کو منظوم خراج عقیدت ادا کیا۔ صدر جلسہ جناب بدر الدین طیب جی نے صدارتی تقریر میں ذاکر صاحب کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے ذاکر صاحب سے اپنے تعلقات کا ذکر کیا اور کہا کہ ان کی موت ایک عظیم تہذیب اور کلچر کی موت ہے۔

(وقار خلیل)

ریسرچ ایسوسی ایشن شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی میں ڈیوڈ میتھیوز کی تقریر

علی گڑھ۔ شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی کی ریسرچ ایسوسی ایشن کا ایک جلسہ ۲۹ مئی کو پروفیسر آل احمد سرور کی صدارت میں ہوا جس میں لندن یونیورسٹی میں اردو کے استاد جناب ڈیوڈ میتھیوز نے اردو زبان و ادب سے متعلق اپنے تاثرات بیان کئے۔ سرور صاحب نے ڈیوڈ میتھیوز کا تعارف کراتے ہوئے فرمایا کہ ڈیوڈ میتھیوز لندن میں اردو ادب کے استاد ہیں۔ آج کل انگریزی میں حالی کی حیات جاوید کا ترجمہ کر رہے ہیں۔ چند ماہ سے ہندوستان ہی میں ہیں اور یہاں انھوں نے اردو مرثیوں کے نمونوں کے علاوہ اردو ادب سے متعلق آثار و نقوش جمع کئے ہیں۔ اس سلسلہ میں ان کا معاملہ پیشہ کا نہیں بلکہ عشق کا ہے۔

ڈیوڈ میتھیوز نے اپنی تقریر میں کہا کہ ابھی دو سال ہوئے میں نے اردو ادب کی تدریس شروع کی ہے اور میں اس ادب سے متاثر ہوا ہوں۔ انھوں نے اس بات کا اعتراف کیا کہ اردو کی تعلیم دینے میں بعض دقتیں ہیں کیونکہ ہندوستان کی تہذیب اور یورپ کی تہذیب میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے ایک لڑکی کا ذکر کیا جو عالمی ادب سے دلچسپی رکھتی تھی لیکن جب اس نے اردو پڑھنا شروع کیا تو اسے اردو ادب میں ایک خوفناک یکسانیت محسوس ہوئی۔ اس سلسلہ میں ڈیوڈ میتھیوز نے اردو غزل کی مثال دی اور کہا کہ اردو کی کلاسیکی غزل جس کی میر، غالب اور ذوق نمائندگی کرتے ہیں ایک خاص ہندوستانی صنف ہے جس کو سمجھنے کے لئے خاصی مدت درکار ہے ظاہر ہے کہ ابتدائی مرحلوں میں ان مشکلات کے ہوتے ہوئے اردو ادب کا صحیح ذوق پیدا کرنا مشکل ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو ادب کا اہم جزو اس کا شعری سرمایہ ہے جبکہ انگلستان میں شاعری کچھ پڑھے لکھے لوگوں کا اجارہ ہے مگر ہندوستان میں عام طور پر لوگ شعر و شاعری سے دلچسپی رکھتے ہیں چنانچہ ایک مجلس عزا کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اس مجلس میں ہزاروں کسان نقش بدیوار بنے مرثیہ سن رہے تھے اس طرح کی مثال قدیم یونان ہی میں ملتی ہے جہاں لاکھوں آدمی سوفوکلیز کے ڈرامے دیکھنے آتے تھے۔ انھوں نے کہا کہ میں یونانی و لاطینی کا طالب علم رہا ہوں اگرچہ یونانی ادب کا اثر ہر یورپین ادب پر ہے لیکن قدیم تہذیب اور ہماری تہذیب میں بعد المشرقین ہے اس لئے اس کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے خاصی مدت درکار ہے۔ ڈیوڈ میتھیوز نے اردو سے انگریزی میں ترجمہ کی دقتوں کا بھی ذکر کیا اس کے علاوہ جدید افسانہ اور شاعری پر بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ڈیوڈ میتھیوز کی تقریر کے بعد بحث میں خواجہ مسعود علی ذوقی، خلیل الرحمٰن اعظمی، انصار اللہ نظر اور بشیر بدر نے حصہ لیا۔ آخر میں صدر جلسہ پروفیسر آل احمد سرور نے فرمایا کہ مجھے خوشی ہے کہ ڈیوڈ میتھیوز کی تقریر کسی فارمولے کے تحت نہیں تھی بلکہ آزادانہ طور پر انھوں نے اپنے تاثرات بیان کئے۔ انھوں نے فرمایا کہ تنقید میں پہلی منزل ذہنی ہمدردی کی ہے۔ ہمیں اپنے ماحول سے نکل کر دیکھنے کی کوشش ہونی چاہئے کیونکہ ابتدائی نقوش کے بنا پر جو فیصلہ کیا جاتا ہے اس میں غلطی کا امکان رہتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو ادب سے متعلق ڈیوڈ میتھیوز کے یہ تاثرات دلچسپ ضرور ہیں لیکن ضروری نہیں کہ جو اثر آج قائم ہے وہ کل بھی رہے اس لئے اس کو فی الحال

ابتدائی تاثر کیا چاہیے نہ کہ مستقل رہنے۔ خلوص سے بالآخر جو تنوع ہے گا اس میں وزن بھی ہوگا اور وقار بھی۔ ادب کے مطالعہ کے سفر میں کعبہ کو ایک ہی راستہ نہیں جاتا بلکہ ترکستان سے بھی ہو کر جاتا ہے۔ سرور صاحب نے فرمایا کہ ڈیوڈ میتھیوز نے قدیم یونانی ادب اور ہمارے قدیم ادب میں جو مماثلت دیکھی ہے وہ خاص طور پر دلچسپ ہے۔ اس مماثلت کا غائر مطالعہ یقیناً مفید ہوگا۔ آخر میں سرور صاحب نے ڈیوڈ میتھیوز صاحب کا شکریہ ادا کیا اور ان کے نشست لیجے پر انھیں مبارکباد دی۔

ذاکر صاحب کی وفات پر مرکزی انجمن کی تعزیتی قرارداد

انجمن ترقی اردو ہند کی مجلس عام منعقدہ دہلی کا یہ جلسہ ڈاکٹر ذاکر حسین صدر جمہوریہ ہند کی اچانک وفات پر اپنے انتہائی رنج و غم کا اظہار کرتا ہے اور ان کی وفات کو ملک و قوم کے لئے ایک ایسا نقصان عظیم سمجھتا ہے جس کی تلافی کی عرصہ دراز تک کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

ڈاکٹر ذاکر حسین صرف ہمارے صدر جمہوریہ ہی نہیں تھے۔ وہ اور بھی بہت کچھ تھے۔ وہ ایک ممتاز ماہر تعلیم، ایک مثالی معلم، ایک اعلیٰ درجے کے مصنف اور صاحب طرز ادیب، سچے وطن کے پروانے، ہماری مشترک تہذیب کے ایک درخشندہ ستارے، انسانیت کی بہترین قدروں کے علمبردار، رواداری، وسیع المشربی، جمالیاتی ذوق، شرافت اور اخلاق کے پیکر تھے۔ ان کی ذات میں اتنی خوبیاں جمع ہوگئی تھیں کہ انھیں صحیح معنی میں لفظ "آدمیت" کہا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین نے اٹاوے اور علی گڑھ میں تعلیم حاصل کی۔ جب ۱۹۲۰ء میں مہاتما گاندھی اور شیخ الہند مولانا محمود الحسن نے طلبہ کو ایم۔ اے۔ او۔ کالج چھوڑنے کا مشورہ دیا تو ذاکر صاحب جامعہ ملیہ میں شریک ہوگئے۔ وہاں سے وہ اعلیٰ تعلیم کے لئے جرمنی تشریف لے گئے اور جرمنی سے واپس آکر انھوں نے جامعہ کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو سنبھالا اور اسے ایک اعلیٰ قومی و تعلیمی ادارہ بنا دیا۔ انھوں نے اپنے گرد اچھے اچھے رفیق جمع کئے اور ان کے ذریعے قومی بنیادوں پر اور اپنی تہذیب اور ماحول کی روشنی میں نئے علمی تصورات عام ہوئے۔

ذاکر صاحب نے گاندھی جی کی ہدایت پر بنیادی قومی تعلیم کی ایک اسکیم ۱۹۳۷ء میں تیار کی۔ یہ اسکیم ہماری تعلیمی دنیا میں اپنے دور رس امکانات کی وجہ سے بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ کچھ لوگوں کے تعصب اور سرکاری حلقوں کی دفتر شاہی کی وجہ سے یہ تجربہ کامیاب نہ ہو سکا مگر جامعہ میں اس کا کامیاب تجربہ کیا گیا۔

ذاکر صاحب نے ۱۹۴۸ء تک بہت قلیل تنخواہ پر جامعہ کی خدمت کی اور اسے ملک کا ایک امتیازی تعلیمی ادارہ بنا دیا۔ اس ادارے میں اردو ذریعہ تعلیم رہی اور اس کے رسالہ "جامعہ" نے اجتماعی علوم اور ادبیات میں قابل قدر اضافہ کیا اور مکتبہ جامعہ نے معیاری کتابیں شائع کیں۔

مولانا آزاد کی خواہش پر ذاکر صاحب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہوئے اور انھوں نے اپنے آٹھ سالہ دور میں یونیورسٹی کی بنیادوں کو مستحکم کیا اور ایک طرف اسے قومی دھارے کے ساتھ چلنا سکھایا اور دوسری طرف اس کی امتیازی خصوصیات کو بھی ملک و قوم سے منوایا۔

۱۹۴۸ء میں جب انجمن ترقی اردو کی نئی تشکیل ہوئی تو ذاکر صاحب اس کے صدر مقرر کئے گئے۔ وہ انجمن کے دفتر کو دہلی سے علی گڑھ لائے۔ انھوں نے انجمن کے علمی و ادبی کاموں کی رہنمائی کی اور جب انجمن نے اتر پردیش میں دستخطی مہم چلائی تو ایک وفد لے کر صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد سے ملے اور اردو کو اتر پردیش، بہار اور دہلی کے علاقے میں سرکاری طور پر تسلیم کئے جانے کے لئے ایک عرضداشت پیش کی۔ خرابی صحت کی بنا پر وہ ۱۹۵۶ء میں انجمن کی صدارت سے مستعفی ہوگئے، مگر انجمن سے ان کی دلچسپی آخر تک رہی اور وہ اس کے منصوبوں میں برابر مفید مشورے دیتے رہے۔ اردو گھر کے لئے انھوں نے اپنی جیب خاص سے ایک ہزار روپے کا عطیہ دیا تھا۔

ذاکر صاحب اردو کے ایک ممتاز مصنف اور ایک صاحب طرز ادیب تھے۔ انھوں نے طالب علمی کے زمانے میں ہی افلاطون کی شہرہ آفاق کتاب "ریاست" کا اردو میں ترجمہ کیا تھا جو انجمن نے ہی چھاپا تھا۔ اس کے بعد انھوں نے اقتصادیات پر کئی کتابیں شائع کیں۔ ان کے تعلیمی خطبات، تعلیمی مسائل پر ان کی بصیرت کا ثبوت ہیں۔ وہ ان کے اسلوب کے بھی بڑے اچھے نمونے ہیں۔ انھوں نے رسالہ جامعہ میں برسوں حالات حاضرہ پر تبصرے لکھے اور بچوں کے لئے متعدد کہانیاں لکھیں جو "ابو خاں کی بکری" اور دوسرے افسانے کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہو چکی ہیں۔

ڈاکٹر ذاکر حسین ۱۹۵۷ء میں بہار کے گورنر، ۱۹۶۲ء میں نائب صدر جمہوریہ اور ۱۹۶۷ء میں صدر جمہوریہ منتخب ہوئے۔ انھوں نے اپنے افکار و اقدار کا خواص و عوام سب پر گہرا اثر چھوڑا اور اپنی علمیت، اپنی بلند نظری، اپنی شرافت اور اپنے حسن اخلاق سے ہندوستان اور اس کے باہر کروڑوں دلوں کو مسخر کر لیا۔ افسوس ہے کہ موت کے ظالم ہاتھوں نے اس محبوب ہستی کو ہم سے چھین لیا۔ یہ جلسہ مرحوم کے حق میں دعائے خیر کرتا ہے اور ان کے پسماندگان سے اپنی گہری ہمدردی کا اظہار کرتا ہے۔

انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ کے پرنٹر و پبلشر سید بنیاد علی نے لیتھو کلر پرنٹرس علی گڑھ میں چھپایا اور دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شائع کیا